شام ہوتی جا رہی ہے
ساقی امروہوی

ساقیؔ امروہوی
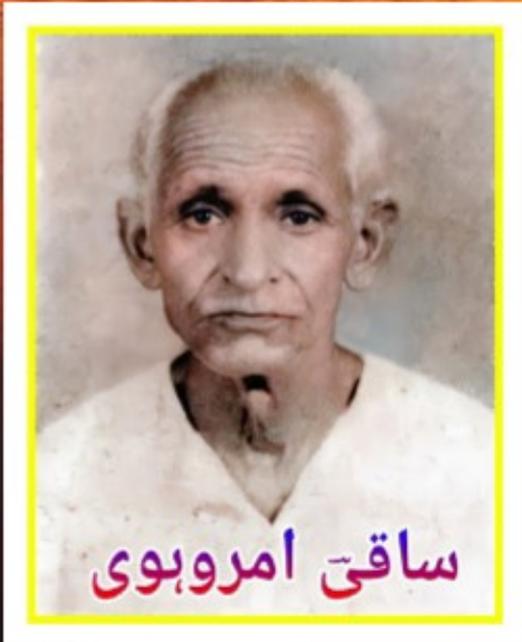
میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گُم تھا
مگر اب شام ہوتی جارہی ہے

# انتساب

اپنے محترم، اپنے محسن
میر جواد علی (میر صاحب)
کے نام

# دریچہ

# ٹوٹا ہوا آدمی، توانا سخن ور

ساقی امروہوی سیدھے سادے، منکسر المزاج اور مسکین انسان نظر آتے ہیں۔ یہی اُن کی شخصیت اور شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ میں نے اُنھیں جب بھی دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے۔ کچھ خاموش خاموش، کچھ اُداس اُداس۔ اپنی شاعری میں بھی وہ اندر سے ٹوٹے ہونے کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے

بکھرنے سے بچا رکھا ہے ورنہ
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں

ساقی امروہوی کی شاعری اندر سے ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹا ہوا آدمی جو سائے کی تلاش میں در بہ در دھوپ سر پر اُٹھائے رواں دواں ہے۔ ساقی اپنی مسکینی کے باوجود توانا لہجے اور اپنے عہد کی تفسیر کرنے والا سخن ور ہے۔ وہ بہ قول خود ایک ایسا حال ہے جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ تاہم زمانے کے ہاتھوں آزار پانے کے باوجود اُس نے ہونٹوں پر تبسم سجا رکھا ہے۔ اُس کے یہاں فکر کی تازگی اور خیال کی ندرت ملتی ہے۔ حال و مستقبل سے بے نیاز ہونے کے باوجود اُسے یہ اعتماد ہے کہ نئی ”منزلیں اُسی کے قدموں کی دھول سے اُبھریں گی۔“ ساقی کی غزل بڑی نکھری، دلآویز اور دردمند دل کی پکار ہے۔ اُس کی غزلیں پڑھ کر غزل کے پُر اعتماد لہجے اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ ساقی کی آواز آج بھی پُر اعتماد ہے اور کل بھی اس اعتماد کا بھرم برقرار رہے گا۔

اسلم فرخی

# گوشہ نشینی سے مسند نشینی تک

عام حالات میں کسی ایسے شخص کی شاعری یا زندگی کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کرنا جو "ہم عصر" بھی ہو اور "ہم عمر" بھی، ایک دشوار مرحلہ ہوتا ہے لیکن یہاں میرا معاملہ تو اس سے بھی سوا نازک ہے کہ ساقی امروہوی ہم عصر اور ہم عمر ہونے کے علاوہ میرے "ہم جلیس" بھی ہیں۔ اور "ہم مشرب" بھی...... اور یہ "ہما ہمی" صرف چند دنوں کی بات نہیں بلکہ نصف صدی کا سلسلہ ہے۔

موجودہ زمانے میں آشنائی یا شناسائی کی عمر اتنی طویل کہاں ہوتی ہے۔ تعلقات کی سمتیں ہی نہیں، سرحدیں بھی بدل جاتی ہیں اور پھر جس دَور کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، اس دَور میں ہمارا معاملہ یوں بھی بہت صبر آزما تھا کہ ہم بھرے پرے گھرانوں سے بچھڑے ہوئے نیم پختہ عمر کے لوگ نہ صرف نئے وطن کے ویرانوں میں تنکا تنکا چن چن کر اپنے اپنے آشیانے بنانے کی تگ و دَو میں مبتلا تھے بلکہ اس شہرِ ناپرساں میں نان ونفقہ کی جستجو میں بھی ہمہ وقت سرگرداں رہتے تھے۔ تاہم نامساعد حالات میں بھی مزاج اور مسائل کی یک سانیت نے ہمارے تعلقات غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے پیوستہ رکھے۔

اس پورے عرصے میں، میں نے ساقی کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی شاعری کے اُتار چڑھاؤ کا مشاہدہ و مطالعہ بھی کیا اور ان کے "ایک شخص" سے "ایک شخصیت" بننے تک کے تمام مراحل کا خاموش تماشائی بھی رہا، گویا ان کی "گوشہ نشینی" سے "مسند نشینی" تک کے طویل سفر کا حساب قدم بہ قدم میرے حافظے پر رقم ہے۔

اس غیر معمولی رفاقت کی "یک رنگی" اور "نغمہ رنگی" دونوں کیفیات کے پیشِ نظر میں خود کو ایک ایسا شخصِ واحد تصور کرتا ہوں جسے ساقی امروہوی کے بارے میں گفتگو کا سب سے زیادہ حق حاصل ہو اور اس استحقاق کے استعمال کا اس سے سنہری موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود ساقی امروہوی کی تحریک پر ان کے اس اہم شعری مجموعے "شام ہوتی جا رہی ہے" کے لیے تعارفی سطور تحریر کرنے کا حکم ملا ہے۔

ساقی نے خونِ جگر کی کشید کا یہ جان لیوا مشغلہ کب سے آغاز کیا؟ اس کا سراغ لگانا محققین کا کام ہے۔ میں تو پیچھے مڑ کر جہاں تک دیکھتا ہوں، مجھے وہ شعر ہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے کہنے دیجیے کہ وہ "شاعر" ہی پیدا ہوئے۔ ادب کی اصطلاح میں اس کیفیت کو "پیدائشی شاعر" کہا جاتا ہے۔ یوں بھی میرے علم و یقین کی حد تک میری ان سے جب سن پچاس میں پہلی بار ملاقات ہوئی تو اس وقت بھی ان کی پہچان "شاعری" ہی تھی۔

لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ساقی نے کوئی نصابی یا روایتی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگر یہ سچ ہو تب بھی

''صدیقی'' ہو کر میں اس سچائی کی تصدیق نہیں کروں گا کیوں کہ اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی منزل تک پہنچنے کے لئے مکتب و مدرسہ کا راستہ اختیار کرنا ضروری نہیں۔ شاعری کی آفرنش سے آج تک کے شعرا کا کلام اس حقیقت کا گواہ ہے کہ اُنھیں شاعر بنانے میں ان کے درسی علم نے کوئی افزائشِ تخلیق کا کردار ادا نہیں کیا۔ البتہ شاعری کے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور ذہانت کی بنیادوں پر فکری تجزیوں میں تعلیمی پس منظر ضرور معاون ثابت ہوا۔ تعلیم کے حصول سے اتنا ثواب ضرور ملتا ہے کہ تخلیقی جوہر وسیع تناظر میں جلوہ دکھاتا ہے اور موازنے کی صلاحیت پیدا ہو کر فکری ارتقا میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ساقی کی شاعری اس تعاون کے بغیر بھی، اپنی خداداد صلاحیت، شعری سماعت (جو مطالعے کا نعم البدل ہو سکتی ہے) اور طویل تہذیبی صحبتوں کی تربیت کے زیرِ اثر استوار ہوئی۔

ساقی کی پختہ شاعری کے خام مواد کا تجزیہ کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ہاں روایت کا عجیب و غریب تسلسل ہے۔ روایتی موضوعات کی بازگشت بھی ہے، پیش پا افتادہ مضامین میں ذاتی تجربات و مشاہدات کی آمیزش سے تجدیدِ فکر کے نمونے بھی ہیں اور روایت کو اپنے زمانے کے حالات پر منطبق کرتے ہوئے تازہ مفاہیم کی کشید بھی ہے جسے توانا روایت کی توسیع بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی سانس لیتی ہوئی، صحت مند روایت کے وسیع تناظر میں انھوں نے سیاست، انقلاب، نظریات، عقائد، فلسفہ اور نفسیات کے مضامین و موضوعات پر اپنی شعری فہم و فراست کے مظاہرے کیے ہیں لیکن اس اظہار کی کلّیت میں کسی خصوصی فلسفۂ فکر کا اتباع نہیں کیا بلکہ ان پر اپنے مخصوص طبعی رجحان اور تخلیقی رویّے کی مہریں ثبت کر دی ہیں۔ یہ فلسفے انھیں کتابوں نے نہیں، زندگی کے تجربوں نے دیے ہیں ۔

لوگ بھوکے ہوں تو یہ عُقدہ کھلے
کون کتنا صاحبِ کردار ہے
پھر بھی تھک کر کہیں نہیں بیٹھا
عمر بھر حادثات سے گزرا

دنیا نے دیکھا کے پیرانہ سالی اور یورشِ آلام کے باوجود ساقی کی ہمّت سپر انداز نہیں ہوئی اور وقت سے نبرد آزمائی کے حوصلے جوان رہے ۔

میں بھی تھک کر نہیں بیٹھا اب تک
حادثوں کا بھی سفر جاری ہے

ساقی کہتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے علاوہ کسی دوسری صنفِ شعر کو منہ نہیں لگایا۔ اور وہ سچ کہتے ہیں کیونکہ اگر انھوں نے کبھی غزل کے علاوہ کچھ اور لکھا بھی تو اس کے پیرایۂ اظہار کے لئے غزل ہی کا پیکر منتخب کیا ۔

تیرا بندہ ہوں، بندگی کے لیے
مجھ کو اوصافِ کبریائی دے

اک نہ اک دن تو اسے سامنے آنا ہوگا
ہم نے اس دن کے لیے خود کو چھپا رکھا ہے

''افتاد'' ان کا پہلا مختصر شعری انتخاب تھا لیکن لوگوں نے دیکھا کہ وہ ان کی آخری منزل نہیں تھی بلکہ فکری سفر کا پہلا پڑاؤ تھا اور اُسی مرحلے پر ان کے معاصرین اور قارئین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی شاعری اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ بات کسی بھی شاعر کے لیے وجہِ امتیاز ہوتی ہے...... بہت سے کوتاہ ظرف تو داد و تحسین کے اسی اوّلین مرحلے پر ہی خیمہ انداز ہو کر ارتقا کے سفر سے منہ موڑ لیتے ہیں لیکن ساقی دوسروں کی داد و تحسین کے لیے نہیں، خود اپنے تخلیقی مزاج کی تسکین کے لیے شعر کہتے ہیں ان کی زندگی نے شاعروں کے نا آفریدہ معیار سے پیمانِ وفا استوار کیا ہے اسی لیے وہ حادثوں کے سفر کے ساتھ ساتھ تازہ بہ تازہ تخلیق کے سفر سے گزر رہے ہیں۔

اردو شاعری میں خصوصاً ذات سے کائنات کے سفر کا رویہ ملتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق ساقی نے اپنی شاعری میں ذات سے کائنات تک کے سفر کے قدم بہ قدم ایک ضمنی سفر بھی جاری رکھا ہے، یعنی ''ذات سے ذات تک کا سفر۔'' یہ سفر دائرہ وار ہے اور اپنے وجود کے اطراف طواف کا تصور پیش کرتا ہے۔ اپنے وجود کا اثبات اور اس اثبات کا اصرار میری نظر میں خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہے اور اس کا اعتراف ایک ایسا اظہارِ ذات ہے جو اُن کے جیسے بے شمار زیست گزاروں کے اجتماعی وجود کا اشاریہ بن جاتا ہے۔

اک تلاطم سا ہے برپا مجھ میں
جانے یہ کون ہے پیاسا مجھ میں

مجھ سے اپنا ضمیر بک نہ سکا
ورنہ آسودہ حال ہو جاتا

اس عہد کے لوگوں میں میرا نام نہیں ہے
صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے

دکھ دیے ہیں زمین والوں نے
کب مرا دشمن آسمان ہوا

کم اپنے مقدر کا اندھیرا نہیں ہوتا
سورج تو نکلتا ہے سویرا نہیں ہوتا

تپش کا اتنا عادی ہوچکا ہوں
کہ اب تو دھوپ بھی سایہ لگے ہے

چھوٹی بحروں کے علاوہ ساقی کا اختصاص اُن کا اپنا تراشیدہ لہجہ ہے جس کی گونج ان کی پوری شاعری میں بسی ہوئی ہے۔ یہ لہجہ منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی ۔

اس پیڑ کے سائے میں سکوں کس کو ملے گا
جس پیڑ پہ چڑیوں کے بسیرے نہیں ہوتے

در بہ در سائے کی تلاش میں ہم
دھوپ سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں

کیا کوئی ہم سے آبلہ پا کی طرح چلے
کانٹوں پہ ہم تو موجِ صبا کی طرح چلے

تیری تصویر بنانے کے لیے
ہم نے لفظوں سے شناسائی کی

اپنے دوست ساقی امروہوی کے اس شعر کی بازگشت میں نے امریکا اور کینیڈا میں بھی سُنی ۔

میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گم تھا
مگر اب شام ہوتی جارہی ہے

یہ شعر اُردو کے ناقابلِ فراموش اشعار میں شمار کیے جانے کے قابل ہے لیکن مجھے اس میں ساقی کی سدا بہار رجائیت کی شکست کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی مفہوم میں ساقی نے ایک اور شعر بھی کہا ہے جس میں اشاریت وایمائیت بھی ہے اور موت کے قدموں کی چاپ سن کر اس اَبدی حقیقت کا حوصلہ مندانہ اعتراف بھی اور مردانہ وار اظہار بھی۔ میں اسی شعر پر ساقی کو درازئ عمر کی دعا دے کر رخصت چاہتا ہوں ۔

اب عجب عالم سرشاری ہے
شاید اب کوچ کی تیاری ہے

سرشار صدیقی

29 مارچ 2002

# کچھ اپنے بارے میں

''شام ہوتی جارہی ہے'' میرا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ میں نے زندگی کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کے جو رنگ اب تک جمع کیے ہیں اور جو لوٹے ہوئے مال کی طرح بٹنے سے بچ گئے ہیں، سادے کاغذ پر بکھیر دیے۔ میں آج بھی یقین رکھتا ہوں کہ مختلف رنگوں کا استعمال انفرادیت کی دلیل ہوتا ہے لیکن اسے پائداری کی علامت نہیں سمجھا جاسکتا۔ چناں چہ ۱۹۴۰ء میں بیت بازی کے دوران ایک شعر

خیال راہبر بھی اب تو دل پر بار ہوتا ہے
یہ کس منزل پہ لے آئیں مجھے گمراہیاں میری

سے شروع ہونے والے اپنے شعری سفر کو جو نامساعد حالات اور غمِ روزگار کا مردانہ وار مقابلہ کرتے گزرا، پائداری کی اُمید کے ساتھ وقت کے سیلِ رواں کے ذریعے آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

۱۹۲۵ء میں امروہہ کے جاگیردار خاندان میں پیدا ہونے والے قائم رضا کو اب اہلِ امروہہ بھی بھول چکے ہیں۔ احباب، ساقی امروہوی کو جانتے ہیں مگر مجھ میں آج بھی وہی بچّہ سانسیں لے رہا ہے جو اپنے دادا سیّد علی اسلم کے سب سے چھوٹے فرزند سیّد علی قاسم کی سب سے بڑی اولاد اور اپنے دادا کا سب سے بڑا ہوتا تھا۔ اماں چاہتی تھیں کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں مگر بچپن کے لاڈ پیار نے میری طبیعت کو لاابالی اور مجھے خودسر بنا دیا۔ چناں چہ میری سرگرمیاں مکتب سے ختم ہو کر اکھاڑے اور مشاعروں میں منتقل ہوگئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں پہلوانی کے زعم میں لڑائی جھگڑے مول لیتا اور فطری صلاحیت کی بنیاد پر اشعار میں فنی نقائص کی نشان دہی کرتا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد فرار ہو کر پاکستان آیا تو پہلی بار زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واسطہ پڑا اور تب سے آج تک میں نے حلال رزق کے حصول کی تگ ودو جاری رکھی اور زندگی کے ہر کٹھن مرحلے سے گزرتا چلا گیا۔ ہرچند کہ بدن ٹوٹ چکا ہے مگر حوصلہ آج بھی جوان ہے اور میں ابھی ہارا نہیں ہوں۔

میرے اعصاب دے رہے ہیں جواب — حوصلہ کب نڈھال ہے میرا

ہر چند کوئی خواب مکمل نہیں ہوا — میں اس کے باوجود پاگل نہیں ہوا

اک عمر کی طویل مسافت کے باوجود — میں چل رہا ہوں میرا بدن شل نہیں ہوا

۱۹۴۷ء میں میری ملاقات میر جواد علی (میر صاحب) سے ہوئی۔ موصوف کے پاس شعرا اور ادبا کا میلا لگا رہتا تھا۔ میر صاحب خود تو شعر نہیں کہتے تھے مگر شاعر گر مشہور تھے۔ انھی کے ہاں میری ملاقات صہبا اختر، صوفی نصیر کیفی، عارف جلالی، تبسم برنی، اطہر نفیس، حبیب جالب، عابد کشمیری، جمال پانی پتی، شکیل نشتر، اسحاق اطہر صدیقی، محشر بدایونی، رسا چغتائی اور سرشار صدیقی سے ہوئی۔

۱۹۴۹ء میں والد کا انتقال ہوا تو اس صدمے اور ایک طویل عرصے کی بے روزگاری نے میری وحشت اور اُداسی میں اضافہ کر دیا۔ اسی کیفیت میں کہا گیا یہ شعر ؎

میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گم تھا
مگر اب شام ہوتی جا رہی ہے

سُن کر میر صاحب نے کہا۔ ''میاں اب تم شاعری چھوڑ دو۔ اس کے بعد اس سے اچھا شعر نہیں کہہ سکتے۔'' تاہم میر صاحب نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے شعر کہنے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ ان کے اصرار اور حوصلہ افزائی نے مجھ میں اعتماد بھی پیدا کیا۔ میں غزلیں کہتا رہا اور ذہن میں محفوظ کرتا گیا لیکن جب کئی برس بعد پہلے مجموعۂ کلام ''افتاد'' کی طباعت کا وقت آیا تو نہ وہ جوانی کی یاد داشت رہی تھی اور نہ وہ میر صاحب جنھیں میرے اشعار ازبر تھے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس دوسرے مجموعۂ کلام کی تدوین کے موقع پر ہوئی۔

۵۱-۱۹۵۰ء میں رضی اختر شوق، قابل اجمیری، وقار صدیقی اور سلیم احمد سے قربتیں رہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے متقدمین اور متاخرین دونوں سے سیکھا ہے اور اب تک سیکھنے کا عمل جاری ہے۔ میں کسی خوش فہمی میں پہلے مبتلا تھا اور نہ اب ہوں۔ میرا مسئلہ شعر کہنا ہے اور میں تا حیات شعر کہتا رہوں گا۔

مجموعہ کلام احباب اور خاص طور سے فاطمہ حسن، خالد معین، عاصم اعجاز اور انیق احمد کے اسرار پر جمع کیا گیا ہے۔ تدوین میں عاصم اعجاز کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور یہ کتاب کی شکل میں نذرِ قارئین ہے۔ مجھے امید ہے کہ ناقدانِ فن اپنے قیمتی مشوروں سے آگاہ کریں گے۔

قائم رضا ساقی امروہوی

# حمد

سبھی کے دل میں سبھی کی نظر میں رہتا ہے
وہ سب کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے

وہ ایک حُسن جسے حُسنِ لازوال کہیں
اُسی کا عکس شعورِ بشر میں رہتا ہے

اُسے تلاش کروں روشنی کے متوالو
وہ اک چراغ ہے جو سب کے گھر میں رہتا ہے

کوئی بتائے اندھیرے میں روشنی کی طرح
وہ کون ہے جو دلوں کے نگر میں رہتا ہے

نہ اس کا رنگ ہے کوئی نہ رُوپ ہے ساقی
جو اُس کا حُسن ہماری نظر میں رہتا ہے

# نعت

تمنا ہے ترے محبوب کی مدح و ثنا لکھوں
مجھے توفیق دے یا ربّ کہ نعت مصطفیٰ لکھوں

تمھی اوّل تمھی آخر، تمھی آخر تمھی اوّل
تمھی کو ابتدا لکھوں تمھی کو انتہا لکھوں

تمھی حامد بھی ہو محمود بھی ہو اور محمد بھی
تمھیں سوچوں تو کیا سوچوں تمھیں لکھوں تو کیا لکھوں

بحمداللہ دعوے دار تو سب ہیں غلامی کے
کوئی ایسا بھی ہے جس کو محمد ﷺ آشنا لکھوں

تمھاری ذات تو خود عکس خلاق دو عالم ہے
تمھیں بتلاؤ میں اب اور کیا اس کے سوا لکھوں

انھیں معلوم ہے ساقیؔ کہ میرا مدّعا کیا ہے
میں کیا سرکار ﷺ کی خدمت میں دل کا مدّعا لکھوں

اگر میں زندگی سے ہار جاتا
تو پھر ہوتا برا بے کار جاتا

بچانے ہم کو سورج کی تپش سے
کہاں تک سایۂ دیوار جاتا

اگر دنیا کسی کو راس آتی
تو اس دنیا سے کیوں بے زار جاتا

سرافرازی نہ تھی قسمت میں ورنہ
یہ سر کٹ کر سر دربار جاتا

محبت کا کرم ہے ورنہ ساقی
غمِ دنیا تو مجھ کو مار جاتا

کبھی میں برف کی مانند پگھلا
کبھی دہکا تو انگارہ ہوا ہوں

مجھے شاید یہ حسرت مار ڈالے
کبھی تو کوئی سینے سے لگا لے

اسے کیا خوف ہوگا تیرگی کا
جو آنسو اپنی پلکوں پر سجا لے

پرستش کر رہے ہیں لوگ اُن کی
جو بُت ہم نے بنا کر توڑ ڈالا

وہاں بھی روشنی بانٹی ہے ہم نے
جہاں ناپید دیکھے ہیں اُجالے

اُسے میں کیا سُناؤں قصۂ غم
سُنے جو شوق سے اور ہنس کے ٹالے

میں دنیا کو بھول چکا ہوں
دنیا کو میں کیوں یاد آیا

تمام عمر میں ہر صبح کی اذان کے بعد
اک امتحان سے گزرا اک امتحان کے بعد

خدا کرے کہ کہیں اور گردش تقدیر
کسی کا گھر نہ اُجاڑے مرے مکان کے بعد

یہ راز اس پہ کھلے گا جو خود کو پہچانے
کہ اک یقین کی منزل بھی ہے گمان کے بعد

دھرا ہی کیا ہے مرے پاس نذر کرنے کو
ترے حضورِ مری جان میری جان کے بعد

یہ جرم کم ہے کہ سچائی کا بھرم رکھا
سزا تو ہونی تھی مجھ کو مرے بیان کے

مرے خدا اسے اپنی امان میں رکھنا
جو بچ گیا ہے مرے کھیت میں لگان کے بعد

سامنے جب کوئی بھر پور جوانی آئے
پھر طبیعت میں مری کیوں نہ روانی آئے

کوئی پیاسا بھی کبھی اُس کی طرف رُخ نہ کرے
کسی دریا کو اگر پیاس بجھانی آئے

زندگی بھر مجھے اس بات کی حسرت ہی رہی
دن گذاروں تو کوئی راست سہانی آئے

میں نے حسرت سے نظر بھر کے اُسے دیکھ لیا
جب سمجھ میں نہ محبت کے معانی آئے

اُس کی خوشبو سے کبھی میرا بھی آنگن مہکے
میرے گھر میں کبھی رات کی رانی آئے

زہر بھی ہو تو وہ تریاق سمجھ کر پی لے
کسی پیاسے کے اگر سامنے پانی آئے

عین ممکن ہے کوئی ٹوٹ کے چاہے ساقی
کبھی اک بار پلٹ کر تو جوانی آئے

جو خود کو سُست روی سے تباہ کر دیتا
تو یہ زمانہ مجھے گردِ راہ کر دیتا

تو ہی بتا کہ فرشتے ترے کہاں جاتے
جو اُن کو محرمِ رازِ گناہ کر دیتا

مہ و نجوم نہ ہوتے اگر شریکِ سفر
یہ ہجر تو مری راتیں سیاہ کر دیتا

ستم سبھی نے کیے ہیں کسی سے شکوہ کیا
کبھی کرم بھی کوئی خیر خواہ کر دیتا

مجھی کو اپنی فقیری عزیز تھی ورنہ
مرا خدا تو مجھے بادشاہ کردیتا

مری نظر کے تقاضے کچھ اور تھے ورنہ
میں زندگی کو سپردِ گناہ کردیتا

اگر گمان بھی ہوتا کسی کے آنے کا
متاع دیدہ و دل فرش راہ کردیتا

موت کا ایک دن مقرر تھا
تم نہ ملتے مجھے تو بہتر تھا

کیوں زمانے کی ٹھوکروں میں رہا
میں کوئی راستے کا پتھر تھا

مجھ کو حالات نے سمیٹ لیا
پھیل جاتا تو اک سمندر تھا

اس کو سجدہ کیا ہے آذر نے
خود جو محتاجِ دست آذر تھا

دل مسوسے رہے ہمیں ورنہ
خواہشوں کا تو ایک لشکر تھا

بدگمانی کا اب یہ عالم ہے
خود سے دل بدگمان ہے میرا

جب نہ ذکر لب و رخسار کرے گی دنیا
کس طرح شرحِ غم یار کرے گی دنیا

اہلِ دل کیوں ہوس و عشق کے جھگڑے میں پڑیں
فیصلہ اس کا سرِ دار کرے گی دنیا

میری آوارہ مزاجی پہ شباب آنے دو
لغزشوں سے بھی مری پیار کرے گی دنیا

جس کو رہتا ہو تری زُلفِ پریشاں کا خیال
اس کو کس غم میں گرفتار کرے گی دنیا

تم نقابِ رُخ افسانہ اُلٹ دو ساقی
کیا حقیقت سے بھی انکار کرے گی دنیا

تیرگی حلقۂ زنجیر نظر آئے گی
آج کی رات ذرا ذکر سحر کر

تم پہ کھُل جائے گا دنیا کی حقیقت کیا ہے
تم بھی دنیا کی نگاہوں سے اُتر کر دیکھو

کیا کیجیے سامان یہاں شب بسری کا
نظروں میں ہے انجام چراغ سحری کا

اے میری تباہی کا سبب پوچھنے والو
نظارہ کرو اس کی پریشاں نظری کا

دو چار قدم ساتھ چلے بات تو جب ہے
دعویٰ نہ کرے کوئی مِری ہم سفری کا

ہاتھوں میں انھیں لوگوں کے پتھر نظر آئے
سونپا تھا جنھیں کام یہاں شیشہ گری کا

ہم کیسے صفِ اہل ہُنر میں نظر آتے
سیکھا ہی نہ تھا ہم نے ہُنر بے ہنری کا

دنیا کو خود اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں ہے
ہر سمت جو چرچا ہے مری بے خبری کا

ساقی مجھے اس عہد کی تاریخ سمجھے گی
ایک شخص تھا مارا ہوا شوریدہ سری کا

اس طرح اپنے خاندان میں ہوں
جیسے میں دشتِ بے امان میں ہوں

راس آجائے زندگی شاید
آج تک میں اسی گمان میں ہوں

میری اپنی کوئی زبان نہیں
میں محبت کی ہر زبان میں ہوں

اب تو احساس تک نہیں ہوتا
دھوپ میں ہوں کہ سائبان میں ہوں

سب مجھے اجنبی سے لگتے ہیں
جانے میں کون سے جہان میں ہوں

جس کا پرسانِ حال کوئی نہیں
ایسے ٹوٹے ہوئے مکان میں ہوں

کون کہتا ہے جا رہی ہے رات
اپنا ڈیرہ جما رہی ہے رات

اک نئی صبح کے نقیب ہیں وہ
جن سے دامن بچا رہی ہے رات

وہ تو روشن ہیں آئینے کی طرح
جن کے چہرے چھپا رہی ہے رات

جو نئی صبح کی علامت ہیں
اُن اُجالوں کو کھا رہی ہے رات

جب تلک بھی ہمارے ساتھ رہی
کرب میں مبتلا رہی ہے رات

جن سے کچھ روشنی ہے اے ساقی
ان دِلوں کو بجھا رہی ہے رات

سجا کے خانۂ دل بزمِ کہکشاں کی طرح
ہم اس زمین پہ رہتے ہیں آسماں کی طرح

کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ ہم پر کیا گزری
ہر ایک شخص مِلا یوں تو مہرباں کی طرح

وہ اگلے دور کا آغاز بن کے اُبھریں گے
مِٹا رہے ہو جنھیں حرفِ رائیگاں کی طرح

ہم اپنے کاندھوں پہ بارِ غمِ حیات لیے
رواں دواں ہیں کسی موجِ بے کراں کی طرح

جسے بھی دیکھئے جائے پناہ ڈھونڈے ہے
یہ کیسی دھوپ سروں پر ہے سائباں کی طرح

چمن اُداس ہے سہمے ہوئے ہیں لالہ وگُل
بہار بھی نظر آتی ہے اب خزاں کی طرح

اب اُن کے نقشِ قدم تک کہیں نہیں ملتے
جو چل رہے تھے کبھی میرِ کارواں کی طرح

تلاشِ رزق میں اپنی تو زندگی ساقیؔ
گزر رہی ہے یہاں وقت کے زیاں کی طرح

اک طلاطم سا ہے برپا مجھ میں
جانے یہ کون ہے پیاسا مجھ میں

یاد اک شخص کی جب آتی ہے
پھیل جاتا ہے اُجالا مجھ میں

حد سے بڑھتی ہے اُداسی تو مجھے
کوئی دیتا ہے دلاسہ مجھ میں

میں کہاں چاہنے والا ڈھونڈوں
ہے مرا چاہنے والا مجھ میں

میں ہوں اور بے سروسامانی ہے
ڈھونڈتے کیا ہو اثاثہ مجھ میں

کم اپنے مقدر کا اندھیرا نہیں ہوتا
سورج تو نکلتا ہے سویرا نہیں ہوتا

اُس پیڑ کے سائے میں سکوں کس کو ملے گا
جس پیڑ پہ چڑیوں کا بسیرا نہیں ہوتا

ہم شرحِ حیات لکھ رہے ہیں
اس عہد کی بات لکھ رہے ہیں

کب ہم نے کہا اسے ستم گر
ہم اس کی صفات لکھ رہے ہیں

وہ لوگ نقیب صبح نو ہیں
جو رات کو رات لکھ رہے ہیں

دنیا کو وہ بات کھل رہی ہے
ہم لوگ جو بات لکھ رہے ہیں

ہم اپنی غزل میں آج ساقی
دستور حیات لکھ رہے ہیں

یہ اہتمام تو دیکھو خزاں کے آنے کا
کلی کلی کے لبوں پر ہے داستانِ بہار

نسیم صبح کی آوارگی بھی کم ہو جائے
کسی مقام پہ ٹھیرے تو کاروانِ بہار

ماضی بھی ہے اُداس مِرے حال کی طرح
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

میں کس کو کیا بتاؤں کہ ہر شخص میرا حال
پوچھے ہے مجھ سے پرسشِ اعمال کی طرح

ہر حال میں ہماری طبیعت بہ فیض عشق
نکھری رہی کسی کے خدوخال کی طرح

ہر دَم ترا خیال مصائب کی یورشیں
روکے ہوئے ہے آج تلک ڈھال کی طرح

اس عہدِ بے شعور میں ساقیؔ ہمارا فن
بانٹا گیا ہے لوٹے ہوئے مال کی طرح

جو دنیا کی تباہی چاہتے ہیں
ہم ان سے خیر خواہی چاہتے ہیں

جو مجرم ہیں ہمارے وہ ہمیں سے
ثبوت بے گناہی چاہتے ہیں

گواہی چاہے جھوٹی ہو کہ سچی
یہاں منصف گواہی چاہتے ہیں

ہمیں یہ رات اب کھلنے لگی ہے
پیام صبح گاہی چاہتے ہیں

انھیں کیا دیدہ ور لکھوں میں ساقی
جو دام کم نگاہی چاہتے ہیں

سوچتا ہوں کہ تماشا بن کر
میں بھی دنیا کا تماشہ دیکھوں

میں نے دنیا کو بہت دیکھا ہے
پھر بھی حسرت ہے کہ دنیا دیکھوں

یوں دَر بدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوں آج تک
اک شخص کی تلاش میں نکلا تھا گھر سے میں

شہرِ ہُنر میں کوئی تو ہو گا ہُنر شناس
کب داد چاہتا ہوں کسی بے ہُنر سے میں

سجدے کی آرزو میں یہ سر بارِ دوش ہے
یہ بوجھ بھی اُتار چلوں، اپنے سر سے میں

ایک شخص بس گیا ہے دلِ خود شناس میں
اچھا لگا تھا وہ مجھے سادہ لباس میں

وہ کون شخص تھا مجھے اب یاد بھی نہیں
بیٹھا ہوا ہوں آج تلک جس کی آس میں

اس نے کچھ اور میرا تجسس بڑھا دیا
جو آج تک نہ آیا کسی کے قیاس میں

دیکھو ذرا اس آئینہ خانے میں غور سے
ہر شخص مبتلا ہے فریب لباس میں

ساقؔی اُسے بھی توڑ کے وہ مطمئن نہیں
اک دل ہی، رہ گیا تھا ہماری اساس میں

قرار پائے گی یا بے قرار گزرے گی
یہ زندگی تو بہر اعتبار گزرے گی

مجھے یقیں ہے کہ آوارگیٔ عشق کے بعد
مری حیات بہت خوشگوار گزرے گی

نہ آئے وہ تو ستاروں سے جی لگالوں گا
کسی طرح تو شب انتظار گزرے گی

خزاں کا غم نہیں ہم کو مگر صبا یہ بتا
کبھی اِدھر سے بھی فصلِ بہار گزرے گی

شبِ فراق گزر بھی گئی تو اے ساقی
مجھے سحر کی فضا ناگوار گزرے گی

حادثوں کے جو درمیان ہوں میں
خود بھی اپنی جگہ چٹان ہوں میں

اپنے بچوں میں ایسا لگتا ہوں
دھوپ میں جیسے سائبان ہوں میں

میرا احوال پوچھنے والے
ابھی ناقابلِ بیان ہوں میں

کم نہیں تجھ سے میری دربدری
لامکاں تو ہے بے مکان ہوں میں

خود میں سمٹوں تو ایک نکتہ ہوں
پھیل جاؤں تو اک جہان ہوں میں

مجھ سے آباء کا نام روشن ہے
کس قدر ننگِ خاندان ہوں میں

میرا بچہ جواں ہوا تو مجھے
یوں لگا جیسے خود جوان ہوں میں

مجھ سے پوشیدہ ہے خدا ساقیؔ
یا پسِ پردہ گمان ہوں میں

بات کر کے کوئی لگن کی سی
کیفیت دے گیا چبھن کی سی

یاد کر کے اسے بھی دیکھ لیا
یاد آتی نہیں وطن کی سی

یاد آیا تھا کون یاد نہیں
تھی وہ خوشبو ترے بدن کی سی

اب تو ہر شے میں ڈھونڈتا ہوں میں
دلکشی تیرے بانکپن کی سی

ہم قفس کو پسند کر بیٹھے
اک جھلک دیکھ کر چمن کی سی

سائے میں کبھی اور کبھی دھوپ میں دیکھا
میں نے اسے ہر رنگ میں ہر روپ میں دیکھا

ان نگاہوں نے پذیرائی کی
انتہا ہوگئی رسوائی کی

آج تک حلقۂ زنجیر میں ہوں
کیا ادا تھی تری انگڑائی کی

اُن خداؤں سے شکایت کیسی
میں نے کس در کی جبیں سائی کی

دل میں اک تازہ کسک چھوڑ گیا
جس مسیحا نے مسیحائی کی

یہ تو کم بخت گزرتی ہی نہیں
کوئی حد ہے شب تنہائی کی

اس سے پوچھو کہ یہ آنکھیں کیا ہیں
ہو ضرورت جسے بینائی کی

تیری تصویر بنانے کے لیے
ہم نے لفظوں سے شناسائی کی

جو واقف ہیں مزاج گمرہی سے
محبت ہے انھیں آوارگی سے

چمن میں پھول بھی تھے خار بھی تھے
گئے ہم حال دل کہنے سبھی سے

خوشی میں بھی نکل پڑتے ہیں آنسو
بہت مانوس ہے غم زندگی سے

یہ اعجاز خود آگاہی ہے ورنہ
محبت کون کرتا ہے کسی سے

شبِ غم کس طرح گزرے گی ساقی
طبیعت بجھ گئی ہے شام ہی سے

جو ہر اک شخص کو بڑائی دے
ایسے اندھے کو کیا سجھائی دے

اے مری گمرہی خدا کے لیے
مجھ کو توفیق رہنمائی دے

کوئی اس زندگی کے صحرا میں
کس کو دادِ شکستہ پائی دے

اس قیامت کے گھپ اندھیرے میں
کس کی صورت کسے دکھائی دے

پھر جلے آتش فراق میں دل
پھر کوئی صدمۂ جدائی دے

تیرا بندہ ہوں بندگی کے لیے
مجھ کو اوصاف کبریائی دے

قیس و فرہاد کے افسانوں میں کیا رکھا ہے
ہم نے انداز جنوں سب سے جدا رکھا ہے

آج تک جس کو کسی نے کبھی دیکھا ہی نہیں
نام اس بُت کا زمانے نے خدا رکھا ہے

کل جو پھیلے گا اندھیرا تو یہ روشن ہوں گے
جن چراغوں کو زمانے نے بجھا رکھا ہے

اس پرُ آشوب زمانے میں ہوا کی زد پر
اک دیا ہم نے محبت کا جلا رکھا ہے

اک نہ اک دن تو اسے سامنے آنا ہوگا
ہم نے اس دن کے لیے خود کو چھپا رکھا ہے

وہ جفاؤں پہ پشیماں تو نہ ہوتا ساقی
حیرتوں نے اسے آئینہ بنا رکھا ہے

کیا کوئی ہم سے آبلہ پا کی طرح چلے
کانٹوں پہ ہم تو موجِ صبا کی طرح چلے

بچھڑے جو قافلے سے تو ہم رہروانِ شوق
منزل کی سمت راہ نما کی طرح چلے

یہ چاہتا ہے حسن بھی یارو کہ ان دنوں
رسمِ ہوس بھی رسمِ وفا کی طرح چلے

ٹھوکر لگی زمیں پہ گرے اور بکھر گئے
جو لوگ سر اُٹھا کے خدا کی طرح چلے

ساقؔی شراب کم ہے ذرا احتیاط سے
محفل میں دورِ جام دوا کی طرح چلے

جب کوئی تازہ امتحان ہوا
اور بھی حوصلہ جوان ہوا

دکھ دیے ہیں زمین والوں نے
کب مِرا دشمن آسمان ہوا

دل پہ کیا کیا گمان گزرے ہیں
جب کوئی شخص مہربان ہوا

میں ادھر چل پڑا اندھیرے میں
روشنی کا جدھر گمان ہوا

میرا اور میری سوچ کا دشمن
میرا اپنا ہی خاندان ہوا

ہم کشتگانِ عشق کا معیار دیکھنا
چاہو اگر کبھی تو سرِ دار دیکھنا

مانا یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں
لوگوں کا مشغلہ تو ہے اخبار دیکھنا

ایک عمر حادثات کی زد پر رہے ہیں ہم
ہم جانتے ہیں وقت کی رفتار دیکھنا

بیٹھے ہوئے ہو سایۂ دیوار دیکھ کر
سایہ سمیٹ لیتی ہے دیوار دیکھنا

ساقی اس انتظار میں بیٹھے ہیں دیکھئے
کب ہوں نصیب صبح کے آثار دیکھنا

غنچہٴ دل کبھی تو کھل جاتا
الجھنوں میں سکون مل جاتا

آ کے ہر شخص اُس کی محفل میں
مسکراتا تو مضمحل جاتا

دل سے دل کا ملاپ کھیل نہ تھا
ایک دل آتا ایک دل جاتا

کیا سناتا کسی کو قصۂ غم
میں سُناتا تو قلب ہل جاتا

فکرِ دنیا میں گھر گئے ساقی
ورنہ اُس کا پتا تو مِل جاتا

یہ تو مانا کہ سحر بھی ہوگی
ہم سے کیا رات بسر بھی ہوگی

میں نے ہر سمت جلائے ہیں چراغ
روشنی کیا مرے گھر بھی ہوگی

ہو تو لینے دو نشیمن تعمیر
خدمتِ برق و شرر بھی ہوگی

وہ لمحے جو تڑپا کے گُم ہو گئے ہیں
نہ جانے کہاں جا کے گُم ہو گئے ہیں

یہ دنیا انھیں اب کہاں پا سکے گی
جو دنیا کو ٹھکرا کے گُم ہو گئے ہیں

ہزار آرزوئیں لیے اپنے دل میں
ترے رُوبرو آ کے گُم ہو گئے ہیں

میں اُن منزلوں سے بھی گزرا ہوں اکثر
جہاں قافلے آ کے گُم ہو گئے ہوں

صدا جستجو میں رہے جس کی ساقی
ہم اکثر اُسے پا کے گُم ہو گئے ہیں

کچھ تو بیگانہ روی عشق کا اعجاز بھی ہے
اور کچھ اہلِ محبت کا یہ انداز بھی ہے

اپنی آوارہ مزاجی سے پریشان بھی ہوں
اور آوارہ مزاجی پہ مجھے ناز بھی ہے

اپنے انجام کی کیا فکر کروں اے ساقی
میرا انجام نئے دور کا آغاز بھی ہے

ہم جہاں سر اُٹھائے پھرتے ہیں
لوگ خنجر اُٹھائے پھرتے ہیں

ہم کو مت چھیڑنا کہ آنکھوں میں
اک سمندر اُٹھائے پھرتے ہیں

دربدر سائے کی تلاش میں ہم
دھوپ سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں

ہم سے پوچھو کہ بے گھری کا غم
کتنے بے گھر اُٹھائے پھرتے ہیں

کون دیکھے کہ اپنا پس منظر
کتنے منظر اُٹھائے پھرتے ہیں

وہ بچھڑتے ہیں مری آنکھ میں آنسو بھی نہیں
ہائے اس تیرہ شبی میں کوئی جگنو بھی نہیں

غیرتِ عشق ذرا تو ہی سہارا دے مجھے
ان کی جانب سے تو اک جنبشِ ابرو بھی نہیں

مسکرا کر نہ اڑا گل کی تباہی کا مذاق
اپنے انجام سے واقف تو کلی تو بھی نہیں

جو مداوائے غمِ عشق کیا کرتے تھے
اب انھیں فرصتِ آرائشِ گیسو بھی نہیں

میں نے دیکھا ہے ہر اک موج کی بیتابی کو
تشنہ کامی کا مداوا تو لب جو بھی نہیں

کس لیے ہنستی ہے دنیا مری بربادی پر
میری آنکھوں میں تو مدت سے اک آنسو بھی نہیں

دیکھیں کیا ہوتا ہے انجام محبت ساقیؔ
فرق تو ان کے تغافل میں سر مو بھی نہیں

کیسے قفس میں گزرے مہ و سال کیا کہیں
کیا کیا تھی آرزوے پر وبال کیا کہیں

کچھ کیف، زندگی میں نہیں ہے ترے بغیر
جینے کو جی رہے ہیں بہرحال کیا کہیں

ہے زندگی سفر میں بڑی آب و تاب سے
کیا ہو گئے ہمارے سن و سال کیا کہیں

بخشی ہے جو ہماری نگاہوں نے دلکشی
تجھ سے ترے حسین خدوخال کیا کہیں

ساقی وفا زمانے میں ناپید ہوگئی
ایسا کبھی پڑا تو نہ تھا کال کیا کہیں

زمانے بھر کو جو نامہرباں سمجھتے ہیں
وہ زندگی کے تقاضے کہاں سمجھتے ہیں

شب فراق جنھوں نے کبھی گزاری ہو
وہی مزاج مہ و کہکشاں سمجھتے ہیں

نظر بچا کے گزرنا تو ان کی عادت ہے
مگر وہ عشق کی مجبوریاں سمجھتے ہیں

سمجھ سکے نہ مزاج بہار کو وہ لوگ
بہار کو جو حریف خزاں سمجھتے ہیں

ہمیں تو عشق کی عظمت کا پاس ہے ساقی
زمانے والے ہمیں بے زباں سمجھتے ہیں

اک عجب عالم سرشاری ہے
شاید اب کوچ کی تیاری ہے

میں ابھی تھک کر نہیں بیٹھا اب تک
حادثوں کا بھی سفر جاری ہے

جو سعیٔ رائیگاں سمجھے گئے ہیں
وہ افسانے کہاں سمجھے گئے ہیں

انھیں پھولوں سے رونق تھی چمن کی
کہ جو وجہ خزاں سمجھے گئے ہیں

جنھوں نے درد بخشا ہے ہمیشہ
مسیحائے جہاں سمجھے گئے ہیں

نہ سمجھا ہم نے دنیا کو تو کیا غم
ابھی ہم بھی کہاں سمجھے گئے ہیں

انھیں سے رونق دنیا ہے ساقی
جو دنیا پر گراں سمجھے گئے ہیں

اگر ہم خود میں تابندہ نہ ہوتے
تو اپنے عہد میں زندہ نہ ہوتے

اندھیرے اور بڑھ جاتے اگر ہم
نقیبِ صبح آیندہ نہ ہوتے

جو لوگ حُسن سے قربت زیادہ رکھتے ہیں
ہر ایک غم کے لیے دل کشادہ رکھتے ہیں

بہت قریب ہیں وہ لوگ اپنی منزل سے
جو آج ترکِ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

فسانۂ غم دل میں بلا کی شوخی ہے
ہم اس فسانے کا عنوان سادہ رکھتے ہیں

جنھیں یقیں ہے کہ منزل انھیں پکارے گی
سفر میں سب سے الگ اپنا جادہ رکھتے ہیں

جو ہنس رہے ہیں تباہی پہ میری اے ساقی
وہ لوگ مجھ سے تعلق زیادہ رکھتے ہیں

طلب آسودگیٔ روح کی لے آئی ہے مجھ کو
کسی صورت مرا احساس بدحالی نہیں جاتا

مرے مولا ﷺ مجھے بھی آگہی کی بھیک مل جائے
سُنا ہے آپ ﷺ کے در سے کوئی خالی نہیں جاتا

وہ جن کو حادثات نے پالا ہے دوستو
اندازِ فکر ان کا نرالا ہے دوستو

رودادِ درد کس کو سُنائیں ہم اہل درد
سُن کر ہر ایک شخص نے ٹالا ہے دوستو

جو ڈس رہی ہے آج بنام سحر ہمیں
اس تیرگی کا نام اُجالا ہے دوستو

آوارگیٔ شوق میں وہ لغزشیں ہوئیں
جن لغزشوں نے ہم کو سنبھالا ہے دوستو

اہلِ ہوس نے اس میں نکالے ہزار عیب
جو لفظ ہم نے منہ سے نکالا ہے دوستو

لوگ مری اس مجبوری پر کہتے ہیں بے ڈھنگا ہوں
تن ڈھانپوں تو پیٹ ہے خالی پیٹ بھروں تو ننگا ہوں

ہو جائے تکمیل محبت دل سے دل مل جائے تو
اُس نے ہمیں کب اپنا سمجھا ہم اس کے کہلائے تو

غم تو یہ ہے آج تلک بھی کوئی ہمیں راس آ نہ آ سکا
ویسے اپنانے کو ہم نے لاکھوں غم اپنائے تو

عہدِ جوانی مدّت گزری ساتھ ہمارا چھوڑ گیا
دل پہ وحشت کیوں طاری ہے کوئی ہمیں بتلائے تو

اس رستے پر چلنے والے سر کو اُٹھا کے چلتے ہیں
راہِ وفا میں سر حاضر ہے سنگ کوئی برسائے تو

میرے ستمگر کہنے پر، ساقیؔ وہ ستمگر برہم ہے
آئینے میں اُس کا چہرہ کوئی اسے دکھلائے تو

اس کے چہرے پہ جو ملاحت ہے
نگہ شوق کی امانت ہے

مجھ کو وہ زندگی عزیز نہیں
جو ہر شخص کی ضرورت ہے

جب تلک بھی ہے سحر ہونے کا امکاں باقی
اک نہ اک اشک رہے گا سر مژگاں باقی

میں ابھی گردشِ حالات سے ہارا تو نہیں
میرے دل میں ہے ابھی جینے کا ارماں باقی

دشت وحشت میں فقط میں ہی اکیلا تو نہیں
کوئی دامن ہے سلامت نہ گریباں باقی

کتنے طوفان گزرنے ہیں ہمارے سر سے
کیا ابھی اور ہے اندیشہ طوفاں باقی

تجھ سے منسوب کریں کون سے افسانے کو
ہم نے لکھنے کو نہ چھوڑا کوئی عنواں باقی

رہ گیا اب تو اندھیرا ہی اندھیرا ہر سمت
کوئی بھی تو نہ رہی شمع فروزاں باقی

اب یہ عالم ہے مری بے سروسامانی کا
جز غم عشق نہیں کوئی بھی ساماں باقی

جتنے چاہے ستم اے گردشِ دوراں کر لے
رہ نہ جائے ترے دل میں کوئی ارماں باقی

کون دیکھے گا اسے دیکھنا یہ ہے ساقیؔ
وہ جو ہونے کو ہے اک صبح درخشاں باقی

آنکھیں بجھی بجھی ہیں دلوں میں ملال ہے
ہر چہرہ میرے شہر میں خود اک سوال ہے

میں بھی تو تیرے حُسن کا آئینہ دار ہوں
کیسے کہوں کہ تو ہی فقط لازوال ہے

رہ کے حجاب میں بھی نمایاں ہے تیرا حُسن
شاید یہ تیرے حُسن کی حدِ کمال ہے

دل میں بھی تو ہی تو ہے نظر میں بھی تو ہی تو
تو ہی بتا یہ تو ہے کہ تیرا خیال ہے

پھر بھی تری تلاش میں پھرتا ہوں دربدر
معلوم ہے مجھے ترا ملنا محال ہے

خوش فہمیاں ہیں صرف تسلی کے واسطے
ورنہ کسی کا کون شریکِ ملال ہے

ساقیؔ بہ فیض عشق میں بے حال تو نہیں
دل مفلسی میں بھی مرا آسودہ حال ہے

پوچھتا کیا ہے زمانہ مری قیمت مجھ سے
ابھی پوشیدہ ہے خود اپنی حقیقت مجھ سے

اس نے کیوں میری تباہی پہ کمر باندھی ہے
جانے کیا ہے تم دنیا کو عداوت مجھ سے

آج پھر اُس نے محبت سے مجھے دیکھا ہے
پھر کوئی چال چلے گی مری قسمت مجھ سے

ہوگئیں لاکھ تری راہ میں آنکھیں بے نور
اب بھی قائم ہے وقارِ غم فرقت مجھ سے

غمِ دوراں نے بہت ساتھ دیا ہے ورنہ
کون کرتا ہے زمانے میں محبت مجھ سے

تیری چاہت میں جو گزری ہے قیامت مجھ پر
کوئی پوچھے تو سہی لطفِ قیامت مجھ سے

میں کسی کا کبھی شکوہ نہیں کرتا ساقی
جانے کیوں رہتی ہے لوگوں کو شکایت مجھ سے

مجھ کو اپنی زندگی سے پیار ہے
وہ سمجھتا ہے کہ دنیا دار ہے

میں کس سے حالِ دل کیسے کہوں
راہ میں حائل مرا پندار ہے

لوگ بھوکے ہوں تو یہ عقدہ کھلے
کون کتنا صاحب کردار ہے

گھر کی ویرانی سے کب ڈرتا ہوں میں
ایک سناٹا پس دیوار ہے

مفلسی کا کس سے شکوہ کیجیے
مفلسی تو قسمت فنکار ہے

خیالِ راہبر بھی اب تو دل ہر بار ہوتا ہے
یہ کس منزل میں لے آئیں مجھے گمراہیاں میری

ہر شکل میں تجھی کو تجھے دیکھنے کے بعد
کیا دیکھتا کسی کو تجھے دیکھنے کے بعد

کچھ اور بھی نکھر گئی میری نگاہ میں
دیکھا جو چاندنی کو تجھے دیکھنے کے بعد

سوچا ہے پھینک دوں ترا صدقہ اُتار کے
پھولوں کی دلکشی کو تجھے دیکھنے کے بعد

محسوس کر رہی ہیں نگاہیں ترے بغیر
شدت سے تشنگی کو تجھے دیکھنے کے بعد

میری نگاہ شوق ترستی ہے آج تک
بھر پور زندگی کو تجھے دیکھنے کے بعد

میں تجھ کو کیا بتاؤں مجھے خود خبر نہیں
پاتا ہوں جس کمی کو تجھے دیکھنے کے بعد

ساقیؔ نے پھر کسی کو نہ چاہا تمام عمر
کیا چاہتا کسی کو تجھے دیکھنے کے بعد

چند لمحے ہم نے چاہے تھے خوشی کے واسطے
عمر بھر ترسا ہے دل آسودگی کے واسطے

پھول بننے کی ہوس میں ہو گئی نذرِ خزاں
اِک تبسّم کم نہ تھا ورنہ کلی کے واسطے

جانے کیوں بخشی گئی ہے اس قدر عمرِ طویل
چند لمحے بھی بہت تھے زندگی کے واسطے

تیرگی میں عمر بھر روشن کیے جس نے چراغ
خود وہ ترسا ہے ہمیشہ روشنی کے واسطے

جل گیا پروانہ خود اپنی ہوس کی آگ میں
جان ورنہ کون دیتا ہے کسی کے واسطے

جس شخص سے بھی میرا ستارا نہیں ملتا
اک بار تو ملتا ہوں دوبارہ نہیں ملتا

جینے کا مزہ لیتا ہے وہ شخص کہ جس کو
دنیا میں کبھی کوئی سہارا نہیں ملتا

چند سکے بھی نہیں اب تو بشر کی قیمت
بڑھ گئی کتنی ترے شہر میں زر کی قیمت

ہر قدم پر ہیں مری آبلہ پائی کے نشاں
مجھ سے پوچھے کوئی اس راہ گزر کی قیمت

کیوں اُڑاتا ہے زمانہ میرے اشکوں کا مذاق
میں نے چاہی تو نہ تھی خونِ جگر کی قیمت

میں ترے دَر کے سوا سر کو جُھکاتا کیسے
شوقِ سجدہ نے بڑھا دی میرے سَر کی قیمت

رات بھر اشک بہائے ہیں مگر اے ساقی
ہم ادا کر نہ سکے پھر بھی سحر کی قیمت

جن کے دلوں میں اہلِ محبت کے راز ہیں
ایسے بھی کچھ درخت مسافر نواز ہیں

پہونچنا دار تک مشکل نہیں ہے
ہم اہلِ دل کی یہ منزل نہیں ہے

میری مجبوریوں پہ ہنسنے والے
ترے پہلو میں شاید دل نہیں ہے

میں وہ ناکام افسانہ ہوں جس میں
تمھارا نام تک شامل نہیں ہے

خرد کی آخری منزل جنوں ہے
جنوں کی کوئی بھی منزل نہیں ہے

میں ایسا حال ہوں دنیا میں ساقیؔ
کہ جس کا کوئی مستقبل نہیں ہے

ہر کلی چپکے چپکے چٹکتی رہی
اور موجِ صبا سر پٹکتی رہیں

لاکھ طوفاں اُٹھے گردِ آلام کے
زندگی اپنا دامن جھٹکتی رہی

ان سے احوال کہنے کو سب کچھ کہا
پھر بھی اِک بات دل میں کھٹکتی رہی

کون پرسان حال ہے میرا
زندہ رہنا کمال ہے میرا

جانے کیوں دل ملول رہتا ہے
کب کسی کو ملال ہے میرا

چڑھتا سورج بتا رہا ہے مجھے
بس یہیں سے زوال ہے میرا

تو نہیں تو ترا خیال سہی
کوئی تو ہم خیال ہے میرا

لاکھ بدحال ہوں تو کیا غم ہے
دل تو آسودہ حال ہے میرا

میرے اعصاب دے رہے ہیں جواب
حوصلہ کب نڈھال ہے میرا

سب کی نظریں مری نگاہ میں ہیں
کس کو کتنا خیال ہے میرا

یہ سوچ کر گزار دی فریاد کے بغیر
کیا لطفِ زندگی کسی افتاد کے بغیر

سب چل رہے ہیں اور کسی کو خبر نہیں
کب کون قید ہو گیا صیاد کے بغیر

آوارگی میں عمر گزاری ہے لیکن اب
لگتا نہیں ہے جی کہیں اولاد کے بغیر

ہم جیسے کچھ چراغ ہواؤں کی زد پہ بھی
روشن ہیں آج تک کسی امداد کے بغیر

کیا مدرسے کی قید نصاب خود آگہی
پڑھتا رہا ہوں میں کسی استاد کے بغیر

میں تجھ کو بھول جاؤں مگر مسئلہ یہ ہے
کیسے کٹے گی عمر تری یاد کے بغیر

ہم تو لہجے ہی کا آہنگ لیے پھرتے ہیں
لوگ اس شہر میں اب سنگ لیے پھرتے ہیں

ایک سینے میں تڑپتا ہوا دل ہے جس کو
ہم محبت سے ہم آہنگ لیے پھرتے ہیں

رنگ بھرنے کے لیے ہم تری تصویروں میں
آج بھی جذبۂ صد رنگ لیے پھرتے ہیں

یہی اجداد سے ورثے میں ملا ہے ہم کو
ہم جو اک دفترِ فرہنگ لیے پھرتے ہیں

حالِ دل کوئی یہاں کس کو سُنائے ساقیؔ
لوگ سینے میں تو دل تنگ لیے پھرتے ہیں

اس چمن کو کبھی صحرا نہیں ہونے دوں گا
مر مٹوں گا مگر ایسا نہیں ہونے دوں گا

جب تلک بھی مِری پلکوں میں دیے روشن ہیں
اپنی نگری میں اندھیرا نہیں ہونے دوں گا

تو اگر میرا نہیں ہے تو مجھے بھی ضدّ ہے
میں تجھے بھی کبھی تیرا نہیں ہونے دوں گا

رت جگوں نے مِری آنکھوں کی بصارت لے لی
دلِ بینا تجھے اندھا نہیں ہونے دوں گا

دفن ہو جائے گا خود رات کی تاریکی میں
جو یہ کہتا ہے سویرا نہیں ہونے دوں گا

دل تو جس کو بھی دیا اس نے دل آزاری کی
اب میں اس دل کو کسی کا نہیں ہونے دوں گا

حوصلہ دل کا جواں ہے تو میں خود کو ساقؔی
زندگی بھر کبھی بوڑھا نہیں ہونے دوں گا

نِت نئے روگ لگا رکھے ہیں اس جان کے ساتھ
زندگی ہم نے گزاری ہے بڑی شان کے ساتھ

کون ہوتا ہے بجز بے سرو سامانی کے
دشت غربت میں کسی بے سروسامان کے ساتھ

اب یہاں عام ہے ایمان فروشی کا ہُنر
زندگی کیسے گزارے کوئی ایمان کے ساتھ

میری پہچان تو اے جانِ تمنّا تو ہے
نام تو آئے گا تیرا مری پہچان کے ساتھ

آندھیاں ایسی چلی ہیں کہ الٰہی توبہ
لوگ تنکوں کی طرح اُڑ گئے طوفان کے ساتھ

اُس میں سویا ہوا انسان نہ جاگا ورنہ
آدمی ظلم نہ کرتا کسی انسان کے ساتھ

ہم فقیروں کا تو مسلک ہی جدا ہے ساقی
دوستی ہم نہیں رکھتے کسی سلطان کے ساتھ

خدا نے کیوں دل درد آشنا دیا ہے مجھے
اس آگہی نے تو پاگل بنا دیا ہے مجھے

تمہی کو یاد نہ کرتا تو اور کیا کرتا
تمہارے بعد سبھی نے بھلا دیا ہے مجھے

صعوبتوں میں سفر کی کبھی جو نیند آئی
مرے بدن کی تھکن نے اُٹھا دیا ہے مجھے

میں وہ چراغ ہوں جو آندھیوں میں روشن تھا
خود اپنے گھر کی ہوا نے بُجھا دیا ہے مجھے

تپا تپا کے غم زندگی کی بھٹی میں
شعور عشق نے کندن بنا دیا ہے مجھے

مجھے خود اپنی نگاہیں تلاش کرتی ہیں
یہ کس نے میری نظر سے چھپا دیا ہے مجھے

بس ایک تحفہ افلاس کے سوا ساقی
مشقتوں نے مری اور کیا دیا ہے مجھے

مجھ میں جو کرب میری ذات کا ہے
مسئلہ ساری کائنات کا ہے

اس قدر کیوں ہے مضطرب اے دل
منتظر کس کے التفات کا ہے

محو حیرت ہیں سارے آئینے
عکس کس میں تری صفات کا ہے

بُجھ نہ جانا کہیں چراغِ اُمید
معرکہ صرف ایک رات کا ہے

رات دن بارِ غم اُٹھاتا ہوں
بس یہی مشغلہ حیات کا ہے

یاد رکھے مجھے دنیا تری تصویر کے ساتھ
رنگ ایسے تری تصویر میں بھر جاؤں گا

اس اُداسی کے تصور ہی سے ڈر لگتا ہے
شہر سے لوٹ کے جب شام کو گھر جاؤں گا

راس آئی نہ محبت مجھے ورنہ ساقیؔ
میں نے سوچا تھا کہ ہر دل میں اُتر جاؤں گا

خوشی کا ایک وہ لمحہ جو زندگی میں نہیں
یہی تو غم ہے وہ لمحہ کسی خوشی میں نہیں

میں سوچتا ہوں کہ آخر وہ کون سا غم ہے
جو اس جہاں میں ہے اور میری زندگی میں نہیں

بقدر ظرف سبھی کو شعور ہے غم کا
مگر شعورِ محبت ہر آدمی میں نہیں

وہ ایک لمحہ جسے حاصل حیات کہیں
ابھی وہ لمحہ گرفتِ خود آگہی میں نہیں

مِری تباہی پہ ساقی زمانہ ہنستا ہے
نظر ملانے کی جرأت مگر کسی میں نہیں

کہاں جاتا میں اس کی زد سے بچ کر
مِرا دشمن اگر چالاک ہوتا

مجھے بھی لوگ دیوانہ سمجھتے
اگر میں بھی گریباں چاک ہوتا

متاعِ جسم و جاں ہوتے ہوئے بھی
نہ ہونا ہے یہاں ہوتے ہوئے بھی

ہم اب تک دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہیں
سروں پر سائباں ہوتے ہوئے بھی

مسلسل رائیگاں ہوتے رہے ہم
زمیں پر آسماں ہوتے ہوئے بھی

بہاروں کے قدم اُکھڑے نہیں ہیں
گلستاں میں خزاں ہوتے ہوئے بھی

میں جیسے یوسفِ بے کارواں ہوں
امیرِ کارواں ہوتے ہوئے بھی

الگ طرزِ سخن رکھتا ہوں ساقیؔ
میں سب کا ہم زباں ہوتے ہوئے بھی

بات اس عہد میں جس نے بھی کھری لکھی ہے
اس کی قسمت میں یہاں در بدری لکھی ہے

کیوں ہر اک شخص سے میں اپنا پتا پوچھتا ہوں
میری تقدیر میں کیا بے خبری لکھی ہے

یہ چٹکتی ہوئی کلیاں یہ مہکتے ہوئے پھول
کس نے روداد نسیم سحری لکھی ہے

ہم نے جس پیڑ کو سینچا تھا لہو سے اپنے
اس کی ہر شاخ پہ اب بے ثمری لکھی ہے

سارا الزام بصیرت پہ ہماری آیا
ہم نے اس عہد کی جب کم نظری لکھی ہے

کون دیکھے گا سحر کس کو خبر ہے ساقؔی
اپنی قسمت میں تو بس شب بسری لکھی ہے

آرزوؤں نے تو اِک حشر اُٹھائے رکھا
پر مرے دل کو اُداسی سے بچائے رکھا

میں تو مر جاتا ترے ہجر میں جینے کے لیے
اِک نہ اِک روگ میرے جی نے لگائے رکھا

ہم زمانے میں کبھی بوجھ کسی پر نہ بنے
بارِ غم اپنے ہی کاندھوں پہ اُٹھائے رکھا

لاکھ آزار زمانے نے دیے ہیں پھر بھی
ہم نے ہونٹوں پہ تبسّم کو سجائے رکھا

زندگی بھر تری رُسوائی کے ڈر سے ہم نے
خود کو ظاہر نہ کیا تجھ کو چھپائے رکھا

میرے ہونٹوں پہ جو فریاد نہیں ہے میری
سننے والا کوئی رُوداد نہیں ہے میری

میں نے دنیا سے تو جینے کا ہُنر سیکھا ہے
کیسے کہہ دوں کہ یہ استاد نہیں ہے میری

حوصلہ آج بھی جینے کا جواں ہے مجھ میں
زندگی طالب امداد نہیں میری

کیوں نہ آواز اُٹھاؤں کسی ظالم کے خلاف
کیا یہاں فکر بھی آزاد نہیں ہے میری

عمر بھر میں نے جسے ٹوٹ کے چاہا ساقیؔ
اب تو چاہت بھی اسے یاد نہیں ہے میری

کیا کہوں کتنا بٹ چکا ہوں میں
اب تو خود سے بھی کٹ چکا ہوں میں

پھر صف آراء ہوئی ہیں میرے خلاف
جن صفوں کو اُلٹ چکا ہوں میں

اب تو پہچاننا بھی مشکل ہے
دھول میں اتنا اِٹ چکا ہوں میں

وہ بھی مل جائے گا کہیں نہ کہیں
اپنی جانب پلٹ چکا ہوں میں

وہ بھی حائل ہیں میرے رَستے میں
جن کے رَستے سے ہٹ چکا ہوں میں

اَب تو بڑھنے کی جستجو ہے مجھے
جتنا گھٹنا تھا گھٹ چکا ہوں میں

کام کرنے کو وہ بھی باقی ہیں
جن سے معافی نمٹ چکا ہوں میں

جس نے آئینہ دکھایا ہے مجھے
اُس کا چہرہ نظر آیا ہے مجھے

ہر قدم پر مری ناکامی نے
بڑھ کے سینے سے لگایا ہے مجھے

روشنی اور بڑھی ہے مجھ میں
جب ہَواؤں نے بجھایا ہے مجھے

میں کبھی خود پہ بھی ظاہر نہ ہوا
اس قدر تو نے چُھپایا ہے مجھے

اس کے دل میں بھی خلش بن کے رہا
جس نے نظروں سے گرایا ہے مجھے

وہ تری یاد تھی کہ اپنا خیال
رات بھر جس نے جگایا ہے مجھے

میں تو ہر شخص کے عتاب میں ہوں
حرف لکھ کر بڑے عذاب میں ہوں

خود سے غافل رہا صدا ورنہ!
خواب میں تھا کبھی نہ خواب میں ہوں

تو ہی اوجھل نہیں ہے آنکھوں سے
میں تو خود بھی ابھی حجاب میں ہوں

عمر بھر تو مشقتیں کی ہیں
اب تو میں عالمِ شباب میں ہوں

میں بھی خوشبو کی طرح آوارہ
کبھی نرگس کبھی گلاب میں ہوں

وقت نے جس کو بے لگام کیا
ہم نے اس حادثے کو رام کیا

اک نئی صبح کے لیے ہم نے
کتنی راتوں کا احترام کیا

تھک کے بیٹھے تو یوں لگا جیسے
ہم نے اپنا سفر تمام کیا

اپنے ہونے کا رووؑں رونا کیا
میرا ہونا میرا نہ ہونا کیا

داغ جو لگ چکے گناہوں کے
اب انہیں آنسوؤں سے دھونا کیا

کب یہاں رحمتیں برستی ہیں
بیج بنجر زمیں میں بونا کیا

تم میرا دل لہو کیے جاؤ
انگلیاں خون میں ڈبونا کیا

رات اب بیتنے کو ہے ساقیؔ
اب گھڑی دو گھڑی کو سونا کیا

محبت نام تھا کل جس خلش کا
وہ اب بے نام ہوتی جارہی ہے

نہیں موقوف کچھ میرے ہی گھر تک
اُداسی عام ہوتی جارہی ہے

میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گُم تھا
مگر اب شام ہوتی جارہی ہے

یہ حادثات نہ سمجھیں ابھی کہ پست ہوں میں
شکستہ ہو کے بھی ناقابلِ شکست ہوں میں

کوئی تو فلسفۂ ہست و بود سمجھائے
مجھے پتا تو چلے بود ہوں کہ ہست ہوں میں

یہ انکشاف ہوا ہی نہیں ابھی مجھ پر
خودی پرست ہوں میں یا خدا پراست ہوں میں

متاعِ درد سے دل مالا مال ہے میرا
زمانہ کیوں یہ سمجھتا ہے تنگ دست ہوں میں

نہ پاسکیں گے جوانانِ بادہ مست مجھے
خود اپنی ذات میں خم خانۂ است ہوں میں

قبول کس نے کیا میری سرپرستی کو
بظاہر ایک قبیلے کا سرپرست ہوں میں

ملا ہے فقر تو ورثے میں جدِ امجد سے
مجھے یہ ناز ہے ساقیؔ کہ فاقہ مست ہوں میں

جو تری رہ گزر میں غم دیکھے
ایسے غم زندگی میں کم دیکھے

تیری زلفوں کے پیچ وخم تو نہ تھے
زندگی میں جو پیچ و خم دیکھے

جو حقارت سے دیکھتے ہیں ہمیں
ہم نے ایسے بھی محترم دیکھے

ہم نے کیا کیا ستم سہے دل پر
کاش وہ بانیٔ ستم دیکھے

جن کے پہلو میں دل نہ تھا ساقی
ایسے بھی صاحبِ چشم دیکھے

غم کو رفیق جان کے اپنا رہا ہوں میں
راس آئے یا نہ آئے یہ قسمت کی بات ہے

زمانہ نفرتوں میں بٹ رہا ہے
وقار آدمیت گھٹ رہا ہے

یہاں اہلِ گلستاں ہی کے ہاتھوں
نظامِ گلستاں جو پٹ رہا ہے

سدا کوہِ مصیبت کاٹتے ہیں
نہ پوچھو وقت کیسے کٹ رہا ہے

ہَواؤں سے بھی جو ڈرتا تھا کل تک
وہ طوفاں کے مقابل ڈٹ رہا ہے

چلو آندھی کا پس منظر بھی دیکھیں
فضاؤں سے غبار اب چھٹ رہا ہے

اُدھر رونے پہ پابندی ہے ساقؔی
اِدھر غم سے کلیجہ پھٹ رہا ہے

میرے ماضی میں ہے نہ حال میں ہے
روشنی کس کے خدوخال میں ہے

میں ہی تنہا اسیرِ زلف نہیں
قید وہ بھی میرے خیال میں ہے

ایک سورج ضرور نکلے گا
وہ ابھی گردِ ماہ و سال میں ہے

وصل تو موت ہے محبت کی
کیف تو حسرتِ وصال ہی ہے

نام پر ارتقاء کے اے ساقی
آج انسانیت زوال میں ہے

وہی نگاہ جو رعنائیوں سے گزری ہے
کبھی کبھی بڑی رسوائیوں سے گزری ہے

جب بھی اِک شخص کا قیاس کیا
زندگی نے بہت اُداس کیا

کوئی سنتا حکایتِ غم دل
ہم نے لفظوں کو بے لباس کیا

حُسن پر کس قدر نکھار آیا
جب اُسے آئینہ شناس کیا

ہم نے لکھنے کو زندگی کی کتاب
ہر صحیفے سے اقتباس کیا

لاکھ دنیا نے ہم کو غم بخشے
پھر بھی دنیا کا ہم نے پاس کیا

مجھے اس عہد کا سقراط سمجھو
کہ میں سچ بول کر جھوٹا ہوا ہوں

مجھے تلاش ہے جس کی خود اپنی ہستی میں
وہ کوئی شخص تو ہو گا خدا کی بستی میں

بہت فریب دیے ہیں مجھے اُمیدوں نے
اک ایسا وقت بھی آیا ہے تنگ دستی میں

کسی کی جان گھروں میں بھی اب نہیں محفوظ
کہاں سے آ گئے قاتل ہماری بستی میں

ملا جو رزق تو آنکھوں میں آ گئے آنسو
عجیب کیف سے گزرا ہوں فاقہ مستی میں

میں سر اُٹھا کے چلوں اس لیے مجھے شاید
بلندیوں سے اُتارا گیا ہے پستی میں

ہم اپنے زخم دکھاتے پھرے مگر ساقی
نہ آیا فرق زمانے کی چیرا دستی میں

روشنی پھیل تو سکتی ہے سحر ہونے تک
ہم ہی بجھ جائیں گے یہ رات بسر ہونے تک

ایک سے رُوپ میں قطرے کی حقیقت کیا ہے
نت نئے روپ بدلتا ہے گوہر ہونے تک

کہہ رہا ہے میرے بچّے کا لڑکپن مجھ سے
وقت درکار ہے پودے کو شجر ہونے تک

لذّت سنگ سے اب ہوگیا واقف مراسر
بے خبر تھا ترے کوچے سے گزر ہونے تک

مُسکرانے کی تمنّا میں کلی سے پوچھو
کتنے دُکھ سہنے پڑے ہیں گُل تر ہونے تک

لاکھ دنیا نے دیے بے خبری کے طعنے
ہم ہی ظاہر نہ ہوئے اپنی خبر ہونے تک

ایک پل کا بھی بھروسا نہیں ورنہ ساقی
میں تو جی لیتا دعاؤں میں اثر ہونے تک

دن ڈھلے جب بھی گھر گیا ہوں میں
یوں لگا جیسے مر گیا ہوں میں

کوئی مجھ کو سمیٹ بھی نہ سکے
اس قدر کیوں بکھر گیا ہوں میں

کیا گرائے گا وہ نظر سے مجھے
جس کے دل میں اُتر گیا ہوں میں

کتنے ہی لوگ ساتھ چلنے لگے
جس طرف سے گزر گیا ہوں میں

میں اُسے ڈھونڈھنے جدھر بھی گیا
خود سے بھی بے خبر گیا ہوں میں

قصۂ غم سمجھ میں آتا کیا
لوگ بے حس تھے میں سُناتا گیا

وہ تو حیرت سے تک رہا تھا مجھے
میں اسے آئینہ دکھاتا گیا

خود فریبی میں مبتلا رہ کر
میں مسلسل فریب کھاتا گیا

خود سلگتا رہا اندھیروں میں
آندھیوں میں دیے جلاتا گیا

میں مہ مہر کی مانند جو تابندہ ہوں
اس کے معنی تو یہی ہیں کہ ابھی زندہ ہوں

مجھ سے برگشتہ نہ ہو میرا بھی حق ہے تجھ پر
میں بھی اے شہرِ نگاراں ترا باشندہ ہوں

آج کی رات پسِ انداز کرے گی مجھ کو
جانتی ہے کہ چراغِ شب آیندہ ہوں

اے مرے شہر کے لوگو مجھے آزار نہ دو
میں غمِ عشق کی عظمت کا نمائندہ ہوں

جس کی چاہت نے کہیں کا بھی نہ رکھا ساقیؔ
میں اسی جانِ تمنا کے لیے زندہ ہوں

جیتے جی تو کرنا ہوگا جینے کا سامان
دنیا والو تم ہی بتاؤ تن بیچوں یا پان

غم کے افسانے حسینوں کی زباں تک پہنچے
سلسلے گردشِ دوراں کے کہاں تک پہنچے

تیری نظروں کے تقاضوں کو سمجھنے والے
جی نہ بہلا تو در پیر مغاں تک پہنچے

مے کدے میں بھی گئے دیر و حرم میں بھی گئے
دور ہی پایا ہے منزل کو جہاں تک پہنچتے

ہائے وہ پھول جنھیں جانِ بہاراں کہیے
مُسکراتے ہوئے آغوشِ خزاں تک پہنچے

اس بھرے شہر میں کوئی بھی ہم آواز نہیں
ایک تنہا مری آواز کہاں تک پہنچے

ہے ازل سے یہی دستورِ محبت ساقیؔ
بات نغمے سے چلے آہ و فغاں تک پہنچے

وہ چہرہ جو تروتازہ لگے ہے
وہ کیا ویسا ہی ہے جیسا لگے ہے

تہہ گرداب طوفان بلا کا
کہیں موجوں سے اندازہ لگے ہے

تپش کا اتنا عادی ہو چکا ہوں
کہ اب تو دھوپ بھی سایہ لگے ہے

یہ کس منزل میں لے آئی محبت
کہ ہر چہرہ ترا چہرہ لگے ہے

تڑپتا دیکھ کر موجوں کو اکثر
ہر اک دریا مجھے پیاسا لگے ہے

میں اُس ظالم کو ظالم کیسے کہہ دوں
وہ ظالم تو مجھے اچھا لگے ہے

یہی ساقیؔ کہ جو کل تک جواں تھا
سو اَب سو سال کا بوڑھا لگے ہے

بس اسی غم نے بنا رکھا ہے دیوانہ مجھے
کس نے پہچانا مجھے کس نے نہ پہچانا مجھے

کون سی تصویر ایسی ہے کہ جس کے واسطے
اپنی جانب کھینچتا ہے آئینہ خانہ مجھے

کیوں نہ جھک جائے مرے آگے جبینِ خسروی
تو نے بخشا ہے وہ اندازِ فقیرانہ مجھے

وہ بجز اک خواب رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری تنہائی سُناتی ہے جو افسانہ مجھے

میں تو کہتا ہی رہوں گا قصۂ غم عمر بھر
آپ دیوانہ کہیں یا لوگ دیوانہ مجھے

جز خموشی زندگی کا کوئی ہنگامہ نہیں
شہر سے بہتر نظر آتا ہے ویرانہ مجھے

اب مری پہچان خود میرے سوا کوئی نہیں
جو مجھے پہچانتا وہ بھی نہ پہچانا مجھے

جب یہاں ہر رند ساقی ہوش سے بے گانہ ہے
خود بدلنا چاہیے دستورِ مے خانہ مجھے

واقف نہیں جو لوگ سفر کے اُصول سے
سائے کی بھیک مانگ رہے ہیں ببول سے

میں آج تک سفر میں ہوں اس اعتماد پر
ابھریں گی منزلیں مرے قدموں کی دھول سے

اب ڈس رہا ہے ان کے گزرنے کا غم مجھے
جو لمحے میں گزار چکا ہوں فضول سے

جب ہم نہ تھے یہاں تو تجھے جانتا تھا کون
شہرت تجھے ملی ہے ہمارے نزول سے

یہ نشہ بھی شراب کے نشے سے کم نہیں
کیف ملال پوچھ کسی دل ملول سے

اب کے برس یہ کیسی چلی ہے ہَوائے درد
پژمردہ ہو گئے ہیں جو چہرے تھے پھول سے

کیا بیر ہو گیا ہے اثر کو دعا کے ساتھ
لوٹ آئی ہر دعا مری باب قبول سے

شرحِ غم ہائے بے حساب ہوں میں
لکھنے بیٹھوں تو اک کتاب ہوں میں

خواب تھا یا شباب تھا میرا
دو سوالوں کا اک جواب ہوں میں

جو ازل ہی سے نا مکمّل ہے
اس صحیفے کا ایک باب ہوں میں

میری بربادیوں پہ مت جاؤ
اُن نگاہوں کا انتخاب ہوں میں

جی رہا ہوں اس آب وتاب کے ساتھ
جیسے آسودۂ شباب ہوں میں

پوچھتے کیا ہو مرتبہ میرا
خاک پائے ابو ترابؑ ہوں میں

مدرسہ میرا میری ذات میں ہے
خود معلّم ہوں خود نصاب ہوں میں

ایک گھر کی تلاش میں ساقیؔ
آج تک خانماں خراب ہوں میں

زندگی بھر میں سرگرانی سے
ایسے کھیلا ہوں جیسے پانی سے

اور بھی غم نِکھرنے لگتے ہیں
ایک لمحے کی شادمانی سے

ہر کہانی مِری کہانی تھی
جی نہ بہلا کسی کہانی سے

صرف وقتی سکون ملتا ہے
پیاس بجھتی نہیں ہے پانی سے

مجھ کو کیا کیا نہ دُکھ ملے ساقی
میرے اپنوں کی مہربانی سے

اگر ہم مبتلائے غم نہ ہوتے
تقاضے زندگی کے کم نہ ہوتے

سمجھتا کون اسرار محبت
جو اُس دورِ ہوس میں ہم نے ہوتے

جوانی کس قدر بے کیف ہوتی
اگر یہ مختلف عالم نہ ہوتے

دی جگہ حسرتوں کو سینوں میں
کتنے طوفاں ہیں آبگینوں میں

ہم ترا انتظار کرتے رہے
دن بدلتے رہے مہینوں میں

دل تو سینوں میں سب ہی رکھتے ہیں
دل دھڑکتے ہیں کتنے سینوں میں

دوستی کر کے عمر بھر میں نے
سانپ پالے ہیں آستینوں میں

خود تماشا بنا ہوا ساقی
میں کھڑا ہوں تماش بینوں میں

مطمئن ہوں مجھے بخشی ہے فقیری تو نے
میں نے کب تجھ سے کہا ہے کہ مجھے شاہی دے

کس لیے بھیجا گیا ہوں مجھے معلوم تو ہو
مرے مالک مجھے اتنی تو خود آگاہی دے

مجھ سے ہر چند بہت پیار کیا جاتا ہے
پر مرے ہونے سے انکار کیا جاتا ہے

صرف ہوتا ہے بہت دل کا لہو تب جا کر
ظلمتوں کو سحر آثار کیا جاتا ہے

ان سے پوچھے کبھی آزادی کی قیمت کوئی
جن پرندوں کو گرفتار کیا جاتا ہے

دشت غربت میں کہیں تھک کے ٹھہرنے کے لیے
دھوپ کو سایۂ دیوار کیا جاتا ہے

کوئی ان مست غزالوں سے یہ پوچھے ساقیؔ
کیوں نگاہوں کو گنہگار کیا جاتا ہے

تجھ سے بچھڑ کے ایسے بھی لمحات آئے ہیں
تنہائیوں نے سیکڑوں قصّے سُنائے ہیں

ہم تلک جو آئی ہے عشق کے وسیلے سے
اس غزل کا رشتہ ہے میر کے قبیلے سے

دیکھنے میں پیڑوں پر کتنے اچھے لگتے ہیں
جن پھلوں کے ہوتے ہیں ذائقے کسیلے سے

شہر کی فضاؤں پر کیوں یہ خوف طاری ہے
سب گلاب سے چہرے پڑ گئے ہیں پیلے سے

وصل کا وہ لمحہ بھی کیا عجیب لمحہ تھا
وہ بھی تھا نشیلا سا ہم بھی تھے نشیلے سے

کیسے نام لوں ساقیؔ جو بھی میرے دشمن ہیں
ہے تعلق ان سب کا اپنے ہی قبیلے سے

اک عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
وہ کون شخص تھا جسے دیکھا تھا خواب میں

اگر خود سے شناسائی نہ ہوتی
مِرے لفظوں میں سچائی نہ ہوتی

کہاں جاتا اگر گھر کی اُداسی
شریکِ شام تنہائی نہ ہوتی

نہ کرتا رُخ اُدھر کا کوئی دریا
سمندر میں جو گہرائی نہ ہوتی

دعائیں دے نگاہوں کو ہماری
ترے چہرے پہ رعنائی نہ ہوتی

مجھے کب اپنی رُسوائی کا غم ہے
محبت کی تو رُسوائی نہ ہوتی

مِرا ہونا ضروری تھا وگرنہ
تری یہ بزم آرائی نہ ہوتی

جب سے اک شخص خفا ہے مجھ سے
میرا سایہ بھی جدا ہے مجھ سے

جس نے تخلیق کیا ہے مجھ کو
وہ خدا بھی بہ خدا ہے مجھ سے

میرا قد ناپنے والے سُن لیں
میرا بچّہ بھی بڑا ہے مجھ سے

ہر بُرائی تو میرے اندر ہے
کس کو کہہ دوں کہ بُرا ہے مجھ سے

کیا ہوئے عہد گزشتہ کے نقوش
آئینہ پوچھ رہا ہے مجھ سے

مجھ کو ساقیؔ نشاطِ وصل کے بعد
مدّتوں حسرت گناہ رہی

دکھائے دیکھئے دل کی ہوس کیا
یہ دیوانہ ہے دیوانے پہ بس کیا

کہاں پہنچے گی اسرار جنوں تک
خرد کیا اور خرد کی دسترس کیا

ابھی باقی ہے کچھ افسانۂ غم
تجھے نیند آ گئی اے ہم نفس کیا

ہمارے واسطے یکساں ہیں دونوں
گلستاں میں نشیمن کیا قفس کیا

بلانے آئی ہے خود بڑھ کے منزل
سنو کہتی ہے آواز جرس کیا

ہماری آبلہ پائی سلامت
ہمیں روکیں گے ساقی خار و خس کیا

میں اپنی زندگی اس شان سے تحریر کرتا ہوں
کہ یوں لگتا ہے جیسے حُسن کی تفسیر کرتا ہوں

کسی کی بھی کبھی تقلید بھولے سے نہیں کرتا
جو کچھ دل پر گزرتا ہے وہی تحریر کرتا ہوں

پریشاں میں رہوں دنیا پریشانی سے بچ جائے
ٹھہر اے گردشِ دوراں تجھے زنجیر کرتا ہوں

مری تقدیر کے لکھے پہ دنیا خندہ زن کیوں ہے
کسی سے کیا کبھی میں شکوہ تقدیر کرتا ہوں

مجھے دیتی رہی ہے آج تک جس کی سزا دنیا
خدا جانے میں ایسی کون سی تقصیر کرتا ہوں

زمانے کی نگاہوں میں مرا یہ جرم ہے ساقؔی
میں اپنے عہد کے حالات کی تفسیر کرتا ہوں

یہ ہم سے پوچھیے اُمید کیا ہے
اندھیرے میں دیا سا جل رہا ہے

زمانے نے اسی کو دکھ دیے ہیں
جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے

کبھی تم بھی تو اپنا عکس دیکھو
تمھارے سامنے بھی آئینہ ہے

ہے اس کو خوف رسوائی کا اپنی
جو میرا حال مجھ سے پوچھتا ہے

نہ چھیڑ اے گردشِ ایام مجھ کو
ابھی جینے کا مجھ میں حوصلہ ہے

وہی اس عہد میں زندہ رہے گا
جو تاریخ محبت لکھ رہا ہے

چاندنی کس کے گھر میں رہتی ہے
یہ ہمیشہ سفر میں رہتی ہے

ایک ایسی بھی رُت ہے ساون کی
جو مری چشم تر میں رہتی ہے

کوئی صورت بھی ہو بہر صورت
تیری صورت نظر میں رہتی ہے

زندگی کے سفر میں میرے ساتھ
ہر صعوبت سفر میں رہتی ہے

اس دعا کو دعا نہیں کہتے
جو تلاش اثر میں رہتی ہے

منزلیں لاکھ کٹھن آئیں گزر جاؤں گا
حوصلہ ہار کے بیٹھوں گا تو مرجاؤں گا

چل رہے تھے جو مرے ساتھ کہاں ہیں وہ لوگ
جو یہ کہتے تھے کہ رستے میں بکھر جاؤں گا

در بدر ہونے سے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا
گھر مجھے راس نہ آیا تو کدھر جاؤں گا

لاکھ روکیں یہ اندھیرے مرا رستہ لیکن
روشنی ساتھ چلے گی میں جدھر جاؤں گا

محبت کو جو اپنائے گئے ہیں
انھیں پر سنگ برسائے گئے ہیں

بھرم قائم ہے جن سے زندگی کا
یہاں وہ لوگ ٹھکرائے گئے ہیں

جو سچائی کی قیمت جانتے ہیں
وہی سولی پہ لٹکائے گئے ہیں

جو پھولوں کی تباہی کا سبب ہیں
انھیں کو ہار پہنائے گئے ہیں

یہ اُس نے حسرتیں بخشی ہیں یا ہم
کھولنے دے کے بہلائے گئے ہیں

اس طرح روٹھ کر چلے جیسے
دو قدم چل کے لوٹ آئیں گے

انکھ ڈھونڈے گا زمانہ مری تحریروں میں
میں نے جو رنگ بھرے ہیں تری تصویروں میں

ایک لمحے کی مسرت کے لیے کیا نہ کیا
زندگی بیت گئی ہے مری تدبیروں میں

میں کسی زلف کے سائے کی تمنا میں رہا
اور حالات جکڑتے رہے زنجیروں میں

ترکشِ چشمِ غزالاں سے جو پیہم برسے
زندگی ہم نے بسر کی ہے انھیں تیروں میں

سوچتا ہوں وہ مری اپنی ہی تصویر نہ ہو
میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں تری تصویروں میں

میرے احباب مرے حال پہ ہنسنے والے
روشنی ڈھونڈ رہے ہیں مری تحریروں میں

دن کو دن لکھوں شب کو شب لکھوں
کیوں کسی کا حسب نسب لکھوں

کتنے چہروں کو بے نقاب کروں
میں تباہی کا کیا سبب لکھوں

خود کو پہچانتا بھی ہوں کہ نہیں
آئینہ دیکھ لوں تو جب لکھوں

کوئی تو مرکز نظر ٹھیرے
میں جسے حُسنِ منتخب لکھوں

میری ناکامیاں ہیں اور میں ہوں
کیا اسے بھی عطائے ربّ لکھوں

یہ تو موسم صلیب و دار کا ہے
کیا حکایاتِ زلف و لب لکھوں

کوئی سورج نظر نہیں آتا
کس کو ساقی حریف شب لکھوں

عمر اسی میں بیت چکی ہے پائی نہ لیکن منزل اب تک
کتنی راہیں بدل چکا ہوں شامِ غم سے صبحِ طرب تلک

مانا اب اظہارِ محبت کرنا بھی آسان نہیں ہے
لیکن اے فرقت کے مارے آخر یہ خاموشی کب تک

ہم غمِ فرقت کے ماروں نے رکھ لی لاج غمِ فرقت کی
کتنے ہی طوفاں دل میں اُمڈے لیکن آہ نہ آئی لب تک

کیسا ساتھی کیسا رہبر تہمت سے کچھ دُور نہیں ہے
ہمّت سے لے کام مسافر منزل دُور رہے گی کب تلک

اپنی تنہائی کا ساتھی اور تو مونس کوئی نہیں تھا
تاروں ہی سے جی بہلایا شام سے لے کر آخر شب تک

میں جانتا ہوں کہ جو درد لادوا ہوگا
وہی تو میری محبت کا انتہا ہوگا

خود اپنے غم کو سمجھتا نہیں یہاں کوئی
ہمارے غم کا مداوا کسی سے کیا ہوگا

کبھی کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا ہے
کہ آج کوئی میری راہ تک رہا ہوگا

خیال ترک محبت ہی بار ہے دل پر
مآلِ ترک محبت نہ جانے کیا ہوگا

سُنا رہا ہوں زمانے کو حالِ دل ساقی
یہ سوچ کر کہ کوئی درد آشنا ہوگا

بکھرنے سے بچا رکھا ہے ورنہ
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں

کیوں نہ سمجھوں کہ لازوال ہوں میں
اس کی تخلیق کا کمال ہوں میں

ہجر کا غم اُٹھائے پھرتا ہوں
راہیٔ منزل وصال ہوں میں

میرے چہرے کی جھریوں پہ نہ جا
ایک تاریخ ماہ و سال ہوں میں

میرا اپنا کوئی جواب نہیں
خود سوالی ہوں خود سوال ہوں میں

تیرگی جس سے بچ کے چلتی ہے
روشنی کے وہ خدوخال ہوں میں

تجھ کو پہچاننا بھی مشکل تھا
وہ تو کہیے تری مثال ہوں میں

کب کیا ہے شکست کو تسلیم
کیسے کہہ دوں شکستہ حال ہوں میں

اِدھر آیا اُدھر گیا وہ شخص
حادثہ تھا گزر گیا وہ شخص

کوئی آواز دے رہا تھا مجھے
چلتے چلتے ٹھیر گیا وہ شخص

رُخ پہ اُبھرا کبھی جو رنگ حیات
اور بھی کچھ نِکھر گیا وہ شخص

جس نے بخشی ہے زندگی فن کو
جیتے جی آپ مر گیا وہ شخص

میں نے بانہوں میں جب سمیٹا اُسے
ایسا سمٹا بِکھر گیا وہ شخص

چلتی رہی کلیوں کے چٹکنے کی صدا پر
پھر بھی نہ کھلا راز بہاروں کا صبا پر

میں پیمبر نہ سہی ہوں تو پیمبر جیسا
کوئی گھر بھی نہیں ویران میرے گھر جیسا

میں نے اعصاب کو پتھر کا بنا رکھا ہے
ایک دل ہے کہ جو بنتا نہیں پتھر جیسا

میری وسعت کا بھی اندازہ بہت مشکل ہے
ایک قطرہ ہی سہی ہوں تو سمندر جیسا

اہلِ دل، دل کی نزاکت سے ہیں واقف ورنہ
کام لفظوں سے بھی لے سکتے ہیں خنجر جیسا

ہم فقیروں کو کبھی راس نہ آیا ورنہ
ہم نے پایا تھا مقدر تو سکندر جیسا

اسی دیوانے کو کہتا ہے زمانہ ساقیؔ
یہ جو اک شخص نظر آتا ہے خود سر جیسا

لاکھ احساس گنہگاری رہا
پر گناہوں کا سفر جاری رہا

میرا دل زخموں سے چھلنی ہوگیا
اور وہ مصروف گلکاری رہا

رت جگے میرا مقدر بن گئے
اس قدر احساسِ بیداری رہا

کوئی تو بانہیں گلے میں ڈال دے
عمر بھر شوقِ گرفتاری رہا

دل مرا آسودہ تھا ساقی مگر
جانے کیوں احساسِ ناداری رہا

میں نے جس زندگی میں رنگ بھرے
میرے دامن میں اس نے سنگ بھرے

ہم ہی رکھتے ہیں وہ نگاہ کہ جو
اس کا شوخی سے انگ انگ بھرے

کتنی بے کیف زندگی ہوتی
دل نہ ہوتے اگر اُمنگ بھرے

جب کبھی اس کا سراپا لکھا
ہم نے ہر لفظ انوکھا لکھا

ہم سے لکھا نہ گیا رات کو دن
لکھنے والوں نے تو کیا کیا لکھا

ہم نے قاتل کو بھی قاتل نہ کہا
جیسا دیکھا اسے ویسا لکھا

زخم کو زخم نہ لکھا ہم نے
اس کو احسانِ مسیحا لکھا

جو ہمارا نہ ہو سکا ساقی
ہم نے اس شخص کو اپنا لکھا

اس عہد کے لوگوں میں مرا نام نہیں ہے
صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے

میں اگر لازوال ہو جاتا
میرا جینا محال ہو جاتا

آئینہ سامنے نہ تھا ورنہ
وہ مِرا ہم خیال ہو جاتا

مجھ سے اپنا ضمیر بک نہ سکا
ورنہ آسودہ حال ہو جاتا

مجھ کو حسرت رہی کہ دنیا میں
کوئی تو ہم خیال ہو جاتا

وہ تو کہیے تری مثال نہ تھی
ورنہ میں بے مثال ہو جاتا

میں تو سو جاتا کہیں راہ طلب میں تھک کر
عشق ہر گام پہ کرتا رہا بیدار مجھے

ہم بھی ہیں ان شکستہ حالوں میں
جن کو لکھا گیا مثالوں میں

زندہ رہنا محال ہو جاتا
تو نہ بستا اگر خیالوں میں

کیوں پریشاں ہے گردشِ دوراں
کس نے شانہ کیا ہے بالوں میں

رنگ لائی ہماری خاموشی
لوگ اُلجھے رہے سوالوں میں

کس سے کہتا ہے حالِ دل ساقیؔ
کون ہے تیرے ہم خیالوں میں

ہم حدیث لب و رخسار سنائیں کس کو
لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں گزر جاتے ہیں